تہذیب کا دورِ جدید اور اجتہاد کی ضرورت

از ڈاکٹر محمد احسان اللہ خاں صاحب

تقریباً پچاس ہزار سال قبل انسان نے موجودہ شکل و صورت اختیار کی۔ اس زمانے میں وہ زیادہ تر کچے گوشت پر گزارہ کرتا تھا۔ یہ حجری دور کہلاتا تھا۔ جو تقریباً چالیس ہزار سال تک کم و بیش یوں ہی قائم رہا۔ اس دور کا سماجی ڈھانچہ شکار کی تہذیب (HUNTING CIVLIZATION) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

لیکن تقریباً دس ہزار سال قبل اس زمانے کے انسان کو اس کا احساس ہوا کہ وہ محض شکار پر گزارہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ایک طرف انسانی آبادی بڑھ رہی تھی اور دوسری جانب انسانی آبادی کے تناسب سے ان جانوروں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی جن کے گوشت پر ان کا گزارہ ہوتا تھا۔ اس وقت انسانی جان کی قیمت اسی کی تہذیب کے مقابلے میں زیادہ ہونے کی بنا پر اس نے مجبوراً یہ فیصلہ کیا کہ دھیرے دھیرے قدیم تہذیب کے مقابلہ میں ایک نئی تہذیب کو جنم دیا جائے۔ جانوروں کا شکار کرنے کے بجائے ان جانوروں کو پالا جائے جو آسانی سے پالے جا سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں بھیڑ اور بکریوں کے ریوڑ پالے جانے لگے۔ اب شکار کے لیے کم اور پالتو جانوروں کی دیکھ بھال پر زیادہ وقت صرف کیا جانے لگا اور ریوڑوں کو ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ میں لے جایا جانے لگا۔ ایسی صورت میں ایک دوسرا ہی سماجی ڈھانچہ بنا جس کو خانہ بدوش تہذیب (NOMADIC — CIVILIZATION) کہا جاتا ہے اس دور میں جنگلی اناج کے استعمال کا رواج بھی عام ہو گیا۔

مگر انسانی آبادی میں اضافہ نے اس طریق زندگی پر بھی دباؤ ڈالا اور بالآخر یہ معاشی نظام بھی روز افزوں انسانی آبادی کے لیے ناکافی ثابت ہوا۔ تقریباً پانچ ہزار سال پہلے انسان نے کاشتکاری کی جانب رخ کیا۔ ابتدا میں اس نے پہاڑوں کے دامن میں دریا یا جھیل کے کنارے باقاعدہ کاشت شروع کردی۔ جگہ کا انتخاب اس لحاظ سے کیا گیا تھا کہ پہاڑی اور جھیل یا دریا میں شکار کھیلا جائے اور جنگلات کے میدان یا اس کے گرد پالتو جانوروں کو چرایا جائے گا۔ مگر یہ حکمت عملی بھی زیادہ دنوں تک نہیں چل سکی اور بالآخر انسان کو کھلے میدانوں میں آکر وسیع پیمانے پر کاشت کرنی پڑی۔ اس پیشہ کے اختیار کرنے سے جو سماجی ڈھانچہ بنا اس کو زراعتی تہذیب (AGRICULTURE CIVILIZATION) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

پندرھویں صدی عیسوی میں اس کا پھر احساس ہونے لگا کہ انسانی آبادی کے اضافہ کا دباؤ بڑھ رہا ہے اس دباؤ کا اثر زیادہ تر سرد علاقوں میں بسنے والوں پر ہوا نتیجۃً سرد علاقے کے لوگوں کو زراعتی تہذیب کو خیرباد کہنا پڑا۔ ان لوگوں نے بتدریج ایک نیا ذریعہ معاش ڈھونڈ نکالا یعنی نئے کارخانے وجود میں آنے لگے جن کا تیار کردہ سامان دور دراز علاقوں میں بھیجا جانے لگا۔ جس جگہ ایک کارخانہ قائم ہوا۔ اسی کے قریب دوسرا کارخانہ قائم ہونے میں زیادہ آسانی ہوئی۔ اس طرح صنعتی شہر آباد ہونے لگے اور آبادی کا کے علاقے سے صنعتی شہروں میں منتقل ہونے لگی اس طرح جو سماجی ڈھانچہ بنا اس کو صنعتی تہذیب (INDUSTRIAL CIVILIZATION) کہا جاتا ہے۔

اس طرح انسانی تہذیب کو چار واضح تہذیبوں میں تقسیم کیا گیا ہے مگر جب بھی ایک قدیم تہذیب کے افراد نے ترقی یافتہ تہذیب کی سمت میں قدم اٹھانے کی کوشش کی ہے تو ان کو دو قسم کی طاقتوں کا بیک وقت مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ ایک ان کے اندر کے افراد کی مخالفت جو اپنی پارینہ تہذیب کی برتری کا راگ الاپتے ہیں اور بدلے ہوئے

زمانے سے بے نیاز ہو کر اسی تہذیب کے احیا کے لیے اپنی تمام قوت ضائع کرتے رہتے ہیں دوسرا مقابلہ بیرونی محاذ پر غالب تہذیب کے افراد سے ترقی کے ہر میدان میں ایسی حالت میں مقابلہ کرنا ہوتا ہے جبکہ ان کو کسی طرف کی ہمدردی حاصل نہ ہو۔ ایسی صورت میں قدیم تہذیب کے وہی افراد کامیاب ہوتے ہیں جو اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ بلند قوتِ ارادی کے مالک ہوں اور مصائب سے نبرد آزما ہونے میں تکلیف کے بجائے لذت محسوس کرتے ہوں۔ یہ بھی قدرت کا دائمی قانون رہا ہے کہ ہر زمانے میں وہی قوم حاکم رہی ہے۔ جو علمی سماجی فوجی اور سیاسی میدان میں برتر رہی ہے۔ جو قومیں ایک زمانے میں ان شعبوں میں برتری حاصل کر چکی ہوں اور بدلتے ہوئے حالات میں اپنی برتری برقرار نہ رکھ سکی ہوں ان کی تعمیرات محکمہ آثارِ قدیمہ کے حوالے کر دی جاتی ہیں اور ان کے افراد ترقی کے ہر میدان سے نکال باہر کیے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ ازل سے اب تک چل رہا ہے۔ تاریخ میں کہیں بھی اس کی مثال نہیں ملتی ہے کہ قدیم تہذیب جدید دور میں بالکل اسی شکل میں دوبارہ غالب ہوئی ہو۔ لہٰذا یہ قدرت کا قانون معلوم ہوتا ہے کہ قدیم تہذیب کو جُوں کا تُوں واپس لانے کی کوشش قوت اور وقت کا زیاں ہے۔

مسلمان عام طور سے یہ یقین رکھتے ہیں کہ انسانیت کے ہر موڑ پر ایک پیغمبر کی بعثت ہوئی ہے مگر اسلامی تاریخ اور موجودہ کھدائی کے نتیجہ میں جو بات سامنے آئی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شکار اور خانہ بدوش تہذیبوں میں کسی ایک پیغمبر کی بھی بعثت نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ ابتدائی زراعتی تہذیب میں جب انسان نے باقاعدہ پہاڑوں کے دامن میں کاشت شروع کر دی تھی کسی پیغمبر کی بعثت نہیں ہوئی۔ حضرت نوح کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب انسان کھلے میدان میں کاشتکاری کرتا تھا۔ مگر وہ اس زمانے میں کھادر میں کاشت کاری کرتا تھا۔ جہاں کھیتوں کو جوتنا نہ تھا بلکہ سیلاب کے آجانے والی مٹی پر بیج ڈال دیتا تھا لہٰذا اس دور کے انسان کو مسلسل سیلابی طوفان کا مقابلہ

کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے اس دور کے خاص دیوتا دریا اور پانی کے دیوتا تھے۔ حضرت ابراہیم کا وہ دور تھا جب لوہے کی ایجاد ہو چکی تھی۔ اور انسان نے باقاعدہ بھاکھر میں کاشت شروع کر دی تھی وہ زمین کو لوہے کے اوزار سے اچھی طرح جوت کر بیج ڈالتا تھا مگر اس دور کا خاص دیوتا سورج تھا کیونکہ اس کی وجہ سے خشک سالی کا خطرہ رہتا تھا۔

اس دور میں عام طور سے زراعتی پیداوار میں باقاعدہ اضافہ ہوا جسکی وجہ سے دور دراز علاقوں سے تجارت کا موقع فراہم ہوا اور تجارتی کارواں آنے جانے لگے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ حضرت ابراہیم نے کافی سفر کیا۔ حضرت موسیٰ کے دور میں کاشتکاری اپنے عروج پر تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ بھاکھر زمین میں باقاعدگی کے ساتھ کاشت کے علاوہ نہروں کا بھی رواج ہو چکا تھا جس سے انسان زیادہ تر دقتی بارش پر قناعت کرنے کے بجائے آبی وسائل پر بہت حد تک قابض ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں گائے کا مقام بہت زیادہ بلند ہو چکا تھا اور گائے کی پرستش عام ہو چکی تھی حضرت موسیٰ کی کوشش کے باوجود گائے کی عزت انسان کے دل میں گھر کیے ہوئے تھی کیونکہ زراعتی تہذیب میں یہ بہت بڑی دولت تھی ایک طرف اس سے دودھ ملتا تھا اور دوسری طرف بیلوں سے کھیت جوتا جاتا تھا نیز ان کے ذریعہ اناج دیہات سے قصبوں و شہروں میں پہنچایا جاتا تھا اس کے علاوہ اس کے گوبر کو بطور کھاد کے استعمال میں لایا جاتا تھا حضرت عیسیٰ کے دور تک یہ صورتحال کم و بیش قائم رہی۔

آخری پیغمبر کے دور میں زراعتی تہذیب بہت ہی اچھی شکل اختیار کر چکی تھی لیکن جس علاقے میں پیغمبر کی بعثت ہوتی وہاں اس وقت تک خانہ بدوشی کی تہذیب غالب حیثیت رکھتی تھی اور تجارت پیشہ کی وقعت بڑھ رہی تھی۔ لہٰذا اسلامی تہذیب نے خانہ بدوشی تہذیب میں جنم لیا۔ اس پر دھیرے دھیرے زراعتی تہذیب کا غلبہ بڑھا۔ یہ تہذیب اپنے آخری دنوں میں بڑی حد تک صنعتی رنگ اختیار کر چکی تھی۔ مگر یہ رنگ

کافی حد تک محدود علاقے میں رہا لہذا موجودہ دور میں اسلام کی ایک ہی تہذیب نہیں ہے بلکہ ہر علاقے کی اپنی ایک مخصوص (اسلامی) تہذیب ہے۔

مسلمانوں کی تہذیب نیم شکارگاہی تہذیب سے نیم صنعتی تہذیب تک پھیلی ہوئی اور خصوصاً ایک زراعتی تہذیب ہے۔ یہ تہذیب صنعتی دور میں کسی صورت میں بھی اپنی قدیم شکل میں غالب نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ مسلمان اپنی قدیم تہذیب کے احیا کے لیے جتنی کوشش کرینگے اسی حد تک ان کی غلامی کی زنجیریں بھی مضبوط ہوتی جائیں گی۔ ترقی یافتہ مسلم ممالک کو اس پیچیدگی کا احساس ہوتا جا رہا ہے۔ وہ ایک طرف ایسی تمام تحریکوں کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسری طرف اسلامی تہذیب کو جدید ترین صنعتی تہذیب میں تبدیل کرنے کے کوشاں ہیں مگر دوسرے غیر ترقی یافتہ مسلم ممالک ان کے لیے بہت بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کا مسئلہ ایسے ممالک میں اور پیچیدہ ہو جاتا ہے جہاں ان کی اپنی حکومت نہیں ہے بلکہ وہ مشترک حاکم ہیں اور حکومت میں ان کی شرکت یا تو کمزور درجہ کی ہے یا غالب حیثیت رکھتی ہے ایسے ممالک میں ترقی یافتہ مسلمان بحیثیت ایک فرد کے اجتہاد کرتا ہے اور ترقی کے میدان میں اپنا مقام پیدا کرنے کے لیے ایک نیا راستہ نکال لیتا ہے جس کو عموماً پس ماندہ مسلمانوں کی حمایت حاصل نہیں ہوتی اس طرح ان دونوں میں قربت کے بجائے بعد پیدا ہو جاتا ہے اور عام طور سے مسلمان اپنے مسلم حاکم سے بھی انصاف تک حاصل کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

یہ صورت حال بہت ہی تشویشناک ہے اس مسئلہ کے حل کے لیے بہتر یہ ہوگا کہ علماء اور جدید تعلیم یافتہ حضرات مل کر بیٹھیں اور ملک کے حالات اور وقت کا صحیح تجزیہ کر کے ایک جدید طریقہ زندگی طے کریں (ہندوستان میں فی الحال چند ایسے جدید تعلیم یافتہ حضرات بھی ہیں جو براہ راست قرآن اور حدیث کا مطالعہ کر سکتے ہیں ان لوگوں کی شرکت بھی بہت ضروری ہے)

ایسا کیا جانا اسلیے ضروری ہے کہ ایک طرف علم کا میدان کافی وسیع ہوچکا ہے اور سماجی ڈھانچہ کافی پیچیدہ ہوگیا ہے دوسری طرف نہ علماء حضرات کا حلقہ نہ جدید تعلیم یافتہ حضرات کا حلقہ الگ الگ اس لائق ہے کہ صحیح اجتہاد کرسکے جب معاملہ کی نزاکت یہ ہو تو کیسے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ایک فرد خواہ وہ علماء حضرات کے حلقہ کا ہو یا جدید تعلیم یافتہ حضرات کے حلقہ کا صحیح اجتہاد کرسکے اور کسی معاملہ میں صحیح فتویٰ دے سکے مگر جس طرح جان بچانے کیلیے حرام کھانے کی بھی اسلام میں اجازت ہے اسی طرح موجودہ دور میں واضح اسلامی خلافت کی عدم موجودگی میں ہر مسلمان کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے طور پر اجتہاد کرے اور ایسا رویہ اختیار کرے جس سے انسانیت کی بھلائی ہوسکے۔

برھان:۔ فاضل مقالہ نگار نے جو سائنس کے مستند اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ خدا کے فضل و کرم سے بڑے دیندار اور صالح بھی ہیں ان کا یہ مضمون ہم نے اسی لیے شائع کیا ہے کہ ہم اس پر بحث شروع کرنا چاہتے ہیں۔ یوں تو آجکل یہ کہنا ایک فیشن بن گیا ہے کہ زمانہ اب بدل گیا ہے۔ تہذیب بدل گئی ہے سماجی اور معاشی قدریں بدل گئی ہیں اسلیے اسلام کو بھی بدلنا چاہیے چنانچہ اس میں بھی یہی بات دہرائی گئی ہے۔ لیکن ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ جی ہاں! زمانہ بدل گیا اور تہذیب بدل گئی بالکل درست فرمایا۔ لیکن اب صاف صاف یہ بھی بتائیے کہ تہذیب کے اسی دورِ جدید کے وہ کون سے تقاضے ہیں جن کے باعث اسلام کے احکام میں تبدیلی ناگزیر ہے کیا اسکے تقاضے یہ ہیں کہ سوسائٹی میں عورتوں اور مردوں کا آزادانہ اختلاط و ارتباط ہو نائٹ کلبوں کی چہل پہل ہو شراب نوشی اور جوئے پر قدغن نہ ہو! انسان عبادات کو ترک کردے اور زندگی میں کلی آزادی ہو یا اسکے تقاضے یہ ہیں کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم ہو۔ یونیورسٹیاں ہوں تجربہ گاہیں ہوں ایجادات اور اختراعات ہوں صنعت و حرفت اور زراعت و فلاحت میں علوم جدیدہ سے فائدہ اٹھایا جائے اور معیارِ زندگی بلند ہو۔

ہم امید کرتے ہیں کہ فاضل مقالہ نگار ان مسائل پر کھل کر بحث کرینگے جن میں انکے نزدیک تہذیب کے دور جدید کے تقاضوں کے پیش نظر علمائے اسلام کو اجتہاد کی ضرورت ہے ہم انکے یہ مضامین بڑی خوشی سے برہان میں شائع کرینگے اور اسکے بعد پھر خود اپنی معروضات پیش کریں گے۔ بہر حال اب وقت آگیا ہے کہ بات گول مول نہ ہو جو ہو پوری صفائی اور وضاحت کے ساتھ ہو۔ تاکہ ہم کسی قطعی نتیجہ تک پہنچ سکیں۔